مہوش افتخار

تم کیسی محبت کرتے ہو

”خلیل جبران کہتا ہے، ’تم صرف مصیبت اور ضرورت کے وقت دعائیں مانگتے ہو‘ کیا خوش حالی اور فراغت کے دنوں میں بھی تمہارے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ہیں؟“

زیادہ تر لوگوں کا جواب نفی میں ہو گا اور میری ایسے تمام لوگوں سے یہی درخواست ہے کہ اپنے رب کی بندگی اور اطاعت کو اپنے حالات سے مشروط نہ کریں۔ جب وہ ”معبود“ ہوتے ہوئے، آپ کی ذات کی اچھائی اور برائی سے مبرا ہو کر نواز تا ہے تو پھر آپ ”عبد“ ہو کر اتنی بڑی گستاخی کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں؟ کیسے دنیاوی خوشیوں کے پیچھے اپنی اوقات اور اس تمام جہانوں کے خالق و مالک کے بلند ترین رتبے کو فراموش کر سکتے ہیں؟ یہ سوچے بنا کہ جو آپ کی اس ناشکری، خود غرضی اور مادہ پرستی کے باوجود آپ کو بے حد و حساب عطا کر رہا ہے اس کی نعمتوں اور رحمتوں کا تب کیا عالم ہو گا جب آپ اپنے حق بندگی کو اسی طرح ادا کریں گے جیسا کہ آپ کا فرض اور اس رب ذوالجلال کی پاک اور بلند ذات کا حق ہے۔“

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے مہر نے پلکیں موند کر اس احساس کو پوری شدت سے محسوس کیا تھا جس کی لپیٹ میں اس کی ذات کے ساتھ ساتھ روح تک اس طرح سے آ چکی تھی کہ اب اس سحر سے آزاد ہونا ناممکن سی بات لگتی تھی۔ ہر مرتبہ نرم الفاظ میں ڈھلی منفرد، خوب صورت اور سلجھی ہوئی سوچ مہر رحمٰن کو گھنٹوں اس نادیدہ ہستی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی جوان نازک احساسات کا تخلیق کار تھا۔ جو اس قرینے سے لفظوں کا چناؤ کرتا کہ پڑھنے والے کے گرد اس کے جادوئی الفاظ ایک حصار سا قائم کر دیتے۔ جس سے نکلنا مہر کے لیے تو کیا تقریباً تمام قارئین کے لیے ہی عبث تھا۔

عارض کی ہر تحریر کے بعد ایڈیٹر کے نام میں شائع ہونے والا ہر خط اس کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت اور اس بات کی دلیل تھا کہ لفظوں کے اس جادوگر کا سحر سب ہی کے سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ان سب میں مہر رحمٰن بھی شامل تھی۔ جو بظاہر تو پریکٹیکل ہونے کے بہت دعوے کیا کرتی تھی۔ مگر اندر سے ہر لڑکی کی طرح رنگ، خوشبو، بادل، ہوا کی دیوانی ایک ایسے شخص کی منتظر تھی جو نہ صرف صورت بلکہ سیرت میں بھی یکتا ہو۔ جو اس کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کے نازک احساسات اور منفرد خیالات کا بھی اس طرح سے خیال رکھے کہ زندگی کے اس طویل سفر کا ہر لمحہ اس کی ہم راہی میں گلاب بن جائے۔

”کیا سوچا جا رہا ہے جناب؟“ بھاری مگر شوخ لہجے نے سوچوں کے تسلسل کو یک لخت توڑ ڈالا تو مہر نے پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے ناگواری سے دائیں جانب دیکھا۔ جہاں کچھ ہی فاصلے پر اپنے ٹیرس پہ کھڑا شاہ میر ابراہیم اس کا سارا موڈ لمحوں میں غارت کر گیا۔

”لگتا ہے میری مداخلت مزاج یار پہ خاصی ناگوار گزری ہے۔“ آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد کیے شرارت سے قیاس آرائی کی گئی تو مہر رحمٰن نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیتے ہوئے زیر لب دس تک گنتی پڑھ کر اپنے بڑھتے اشتعال پر قابو پانا چاہا۔

”منہ ہی منہ میں گالیاں دے کر کیوں اپنا خون جلا رہی ہو؟ با آواز بلند کوسو تاکہ تمہاری ذات کو تو کم از کم کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ہمارا سر تو ویسے ہی تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔“ لبوں پر شوخ مسکراہٹ سجائے وہ ایک ادا سے سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا سا جھکا۔

”شاباش! چھوٹوں کو بڑوں کے سامنے یونہی تعظیم سے کھڑا ہونا چاہیے۔“ اپنی ”اگنور کرو“ پالیسی پہ عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ مدبرانہ انداز میں گویا ہوئی تو اس کی توقع کے عین مطابق لمحوں میں شاہ میر کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔

ناولٹ

"سال ' ڈیڑھ سال کی چھوٹائی بڑائی کوئی معنی نہیں رکھتی محترمہ!" بھنا کر کہا گیا۔

"آں' آں..... سال ڈیڑھ سال' پورے دو سال!" مسکرا کر تصحیح کی گئی تو چند لمحے اس کی مسکراہٹ کو کینہ توز نگاہوں سے گھورنے کے بعد وہ یک لخت خود بھی مسکرا دیا۔

"اس حسین مسکراہٹ کی خاطر چلو مان لیتے ہیں کہ دو سال۔ مگر کیا کریں کہ چاہے دو ہوں یا دو سو سال ہم اس معاملے میں خود کو بڑا بے بس پاتے ہیں۔"

"کیوں؟" ابرو تان کر پوچھا گیا۔

"کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے۔" اب کی بار آنکھیں ادا سے بند کر کے کھولی گئیں تو وہ اپنے صبر کو مزید آزمائش سے بچانے کی خاطر بنا کوئی جواب دیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خوابوں کی دنیا سے نکل کر دیکھو لڑکی' حقیقت اتنی بھی بری نہیں۔" مہر کے ہاتھ میں تھامے رسالے کو دیکھتے ہوئے کہا گیا تو وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"یہی میں بھی کہتی ہوں۔ خوابوں کی دنیا سے نکل آؤ شاہ میر ابراہیم!"

"اہل حسن' اہل دل کو دستبرداری کے ایسے ظالمانہ حکم تو دیتا ہی رہا ہے۔ مگر کیا کیجیے دل والوں کی بھی یہ روایت رہی ہے کہ۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ تم کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

جذب کے عالم میں شعر پڑھا گیا تو مہر کا خون کھول اٹھا۔

"اس قسم کی تھرڈ ریٹ گفتگو تم ہی کر سکتے ہو۔"

"کیا کریں محترمہ' آپ کے عارض صاحب کی طرح لفظوں کے کھلاڑی جو نہیں ہیں گھما پھرا کر بات کر کے "الوژن" کری ایٹ کرنا ہمیں نہیں آتا۔"

"ہونہہ! عارض اور تمہارا کیا مقابلہ۔" وہ نخوت سے لب سکیڑتے ہوئے بولی۔

"بجا فرمایا۔ کہاں وہ خشک مزاج' لیکچر دیتی شخصیت اور کہاں ہم ساڈیشنگ خوش مزاج نوجوان۔" مسکرا کر انتہائی وثوق سے جواب دیا گیا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"احمق انسان یونہی خوش فہمیوں میں مبتلا رہا کرتا ہے۔"

"مہر رحمٰن صاحبہ! ہم خود کو خوش فہم نہیں بلکہ خود شناس قرار دیتے ہیں۔"

"جو مرضی قرار دیتے پھرو۔ میری بلا سے۔" چیخ کر کہتے ہوئے وہ پلٹ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تو وہ اسے سنانے کو قدرے اونچی آواز میں شوخی سے بولا۔

"چلو تم نہ سہی تمہاری بلا سہی۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔"

"ڈھیٹ!" اگلے ہی پل سیڑھیاں اترتی مہر نے بے اختیار جل بھن کر شاہ میر ابراہیم کو خطاب سے نوازا تھا۔

☼ ☼ ☼

مہر رحمٰن' رحمٰن احمد اور آصفہ رحمٰن کی دو اولادوں میں سے پہلوٹھی کی اولاد تھی جس کے بعد ان کا بیٹا منیب الرحمٰن تھا۔ جب کہ دوسری جانب شاہ میر ابراہیم عرف شاہی تین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔

ابراہیم نفیس اور رحمٰن احمد نا صرف ایک دوسرے کے عزیز ترین دوست بلکہ خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ اپنی اسی جذباتی اور ذہنی وابستگی کی بدولت دونوں نے جب اپنا گھر بنانے کی ٹھانی' تو ایسی جگہ منتخب کی جہاں دو پلاٹ انہیں با آسانی ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ۔یوں جب شادی کے تین سال بعد رحمٰن احمد کے گھر میں مہر کی پیدائش ہوئی تو اس کا زیادہ وقت اپنے گھر کے بجائے ابراہیم انکل کے لان میں شاہ زر اور ماہم کے ساتھ کھیلتے گزرا۔ ماہم اور مہر چونکہ ہم عمر اور اپنے اپنے گھر میں اکلوتی تھیں سو دونوں ہی بچپن سے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم رہی تھیں۔

ماہم کی پیدائش کے دو سال بعد ابراہیم نفیس اور ناہید بیگم کے ہاں شاہ میر کی آمد ہوئی۔ جبکہ آصفہ رحمٰن کے گھر مہر کے چار سال بعد اچانک منیب کی پیدائش نے جہاں دونوں گھروں کی رونقوں میں مزید اضافہ کیا

وہیں اسی سال ابراہیم نفیس کی جواں سال موت نے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتی زندگی کو یک لخت تھام سا لیا۔ ابراہیم صاحب کے اس دنیا سے یوں اچانک چلے جانے کے بعد رحمٰن احمد نے حقیقتاً" اپنی دوستی اور رشتہ داری کا حق اس احسن طریقے سے نبھایا کہ ناہید بیگم اور ان کی اولاد دل سے ان کی اچھائی کے معترف ہو گئے اور یوں پیار محبت' خلوص اور اتفاق کے سائے تلے دھیرے دھیرے ہی سہی لیکن ہر کوئی زندگی کی جانب لوٹ آیا۔

ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہنستے ہنساتے' تتلیوں کے پیچھے بھاگتے کب وہ سب آگے پیچھے بڑے ہو گئے' پتا ہی نہیں چلا اور پتا تو مہر رحمٰن کو شاہ میر ابراہیم کی بدلتی نگاہوں اور بڑھتی امیدوں کا بھی نہیں چلا۔ ساتھ ساتھ کھیلتے اور پروان چڑھتے شاہ میر کے رویوں اور تقاضوں نے کب اور کیسے روپ بدلا اسے سمجھ ہی نہیں آیا اور جب بالآخر اس بات کا احساس ہوا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔

دن بہ دن شاہ میر کی بڑھتی ہمت اور جسارتوں نے پہلے پہل تو مہر کے ہوش گم کر ڈالے' مگر جب ذرا حواس اس جذباتی جھٹکے سے سنبھلے تو اشتعال کی ایک تیز لہر نے اسے سر سے پاؤں تک بھگو ڈالا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس جرائت پہ شاہ میر ابراہیم کو پھانسی پر چڑھا دے جس نے مہر کی عادات' اس کے خیالات اور آئیڈیل کے بارے میں جاننے کے باوجود یہ نیا ڈرامہ شروع کر ڈالا تھا۔

ہر لمحہ ہنسنے ہنسانے والے شوخ اور لاابالی سے شاہ میر سے' اس کی پسند ناپسند سے لے کر ذہنی اپروچ تک کوئی چیز بھی تو میل نہ کھاتی تھی اور اگر وہ مینٹل انڈر اسٹینڈنگ کو نظر انداز کر بھی دیتی تو بھی عمروں کے درمیان موجود فرق کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی ہر لمحہ ذہن میں گھومتے بے شمار خیالات اور نظروں کے سامنے اردگرد کی پروا کیے بغیر' ذو معنی گفتگو کرتے شاہ میر نے حقیقتاً" اسے اندر ہی اندر خائف کر ڈالا تھا مگر اس سے پہلے کہ اس کی یہ گھبراہٹ اور پریشانی مقابل پر عیاں ہو کر اسے اس کی طاقت اور مہر کی کمزوری کا احساس دلاتی۔ اس نے خود پہ قابو پاتے ہوئے نہایت سبھاؤ اور قرینے سے شاہ میر کی ہر بات کو سنتے اور سمجھتے ہوئے بھی اگنور کرنا شروع کر دیا۔ یوں جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی بے وقوفی اور نادانی سے قصداً" نظر چراتا ہو۔

مہر کی اس روش نے پہلے پہل تو شاہ میر کو دل ہی دل میں خاصا شرمندہ کیا۔ مگر جب اس نے محسوس کیا کہ مہر ہر بات جانتے بوجھتے ہوئے انجان بننے کی محض کوشش کر رہی ہے تو اس کے بکھرتے حوصلے اور جذبے پہلے سے بھی بڑھ کر مضبوط ہو چلے۔ اپنی اور مہر کی عمر کے درمیان موجود دو سالہ فرق کی اسے نہ پہلے پروا تھی اور نہ اب۔ اس کے نزدیک اس کے جذبے اتنے کمزور اور بے معنی نہ تھے کہ محض دو سال کے فرق کی بھینٹ چڑھ کر ہمیشہ کی جدائی ان کا مقدر بنا ڈالتے۔ خاندان والے کیا کہیں گے' گھر والوں کا ساری صورت حال جاننے کے بعد کیا ری ایکشن ہو گا' وہ ہر بات سے بے بہرا' مہر کی بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود پوری ثابت قدمی سے اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا اس یقین کے ساتھ کہ اس کے انمول اور سچے جذبے' عمر کے اس بے معنی فرق کو مٹاتے ہوئے' ایک نہ ایک دن نہ صرف مہر سے بلکہ ہر اس شخص سے' جو اس تضاد کو اہمیت دیتا ہو' اپنا آپ منوا کر رہیں گے۔

☼ ☼ ☼

"اب کہو جو کہنے کے لیے اتنی بے چین ہو رہی تھیں۔"

مہر نے کافی اور لوازمات سے بھری ٹرے بیڈ پہ اپنے اور ماہم کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔

"پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو گی۔"

ماہم نے حفظ ماتقدم کے طور پہ کہتے ہوئے اپنے مقابل بیٹھی مہر کو دیکھا تو وہ اس کے چہرے پہ کھیلتی شریر سی مسکراہٹ کو مشکوک نظروں سے تکتے ہوئے بولی۔

"نہیں ہوں گی۔"

"اپنے الفاظ پہ قائم رہنا۔" انگلی اٹھا کر وارن کیا گیا تو اب کے وہ جھنجلا اٹھی۔

"اب بک بھی چکو' کیوں خواہ مخواہ کا سسپنس پھیلا رہی ہو۔"

"ایز یو وش مائی ڈیئر سو قصہ کچھ یوں ہے کہ آج جب آپ نے یونیورسٹی سے ناسازی طبع کے باعث تیسری چھٹی فرمائی' آئی آر ڈپارٹمنٹ اور پوری یونیورسٹی کی ایک جانی مانی اور مشہور ہستی از خود چل کر ہمارے ڈپارٹمنٹ آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آئی۔" بظاہر سنجیدہ تاثر لیے وہ شرارت سے بھرپور لہجے میں گویا ہوئی تو بے یقینی کے باعث لبوں کی جانب کافی کا مگ بڑھاتی مہر کا ہاتھ ساکت اور آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"ڈونٹ ٹیل می! رضا' رضا احسان آیا تھا تمہارے پاس؟"

"جی محترمہ آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ آج تیسرے پیریڈ کے بعد محترم رضا احسان صاحب آپ کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے تھے۔"

"ہائے ماہم! میں کیا کروں' یہ بندہ کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟"

ہاتھ میں پکڑا مگ ٹرے میں پٹختے ہوئے وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ جب کہ دوسری جانب ماہم اس کی ہوائیاں اڑتی دیکھ کر ہنستی چلی گئی۔

"تم تو اپنی کھی کھی بند کرو منحوس!" جھلا کر پاس پڑا تکیہ مسلسل ہنستی ماہم کو مارتے ہوئے وہ جل کر بولی۔

"یہاں میری جان پر بن آئی ہے اور تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہے۔"

"ہنسوں نہیں تو اور کیا کروں۔ ذرا اپنی شکل تو دیکھو' لگتا ہے کہ موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہے۔ مردے کی طرح سفید پڑ گئی ہو۔" بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے مہر کی حالت زار اور اپنے ہنسنے کی وجہ بیان کی تو وہ بے اختیار تپ اٹھی۔

"ہاں تو رنگ تو اڑنا ہی ہے نا! ایک انجان بندہ اچانک اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر پچھلے دس پندرہ دنوں سے مسلسل آپ کا سائے کی طرح پیچھا پکڑ لے' اس کے دوست آپ کو دیکھ کر مسکرائیں' آپ کی غیر موجودگی میں وہ آپ کا حال احوال پوچھتا پھرے تو مس ماہم ابراہیم آپ پریشان نہیں ہوں گی تو کیا خوشی سے بغلیں بجائیں گی؟"

"میں خوشی سے بغلیں بجاؤں گی یا نہیں آئی ڈونٹ نو۔ لیکن کم از کم تمہاری طرح مخبوط الحواس بھی نہیں ہو جاؤں گی۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ ایک لڑکا پیچھے آیا نہیں اور تم ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ گئیں۔ اگر اتنا ہی بڑا دل گردہ تھا تو یونیورسٹی جوائن کرنے کی کیا ضرورت تھی" ماہم نے تیزی سے سیدھے ہوتے ہوئے اس کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تو وہ خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"پریشان ہونا مسئلے کا حل نہیں ہے یار۔ تمہیں چاہیے کہ بجائے اس سے چھپنے کے تم ایک مرتبہ ڈائریکٹ اس سے بات کرلو اور کلیئر اینڈ کٹ ورڈز میں نہایت تمیز اور سلیقے سے اسے اس کے غلط رویے کا احساس دلاؤ۔ اسے یہ بتاؤ کہ اس کی ان حرکتوں سے تمہاری پوزیشن آکورڈ ہو رہی ہے' جو تمہارے لیے خاصی پریشانی کا باعث ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے اس طرح وہ پیچھے ہٹ جائے گا؟" ماہم کے رسان سے سمجھانے پر اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"ویل اگر پیچھے نہیں ہٹے گا تو بھی کم از کم شرمندہ ضرور ہو جائے گا اور اگر نہ بھی ہوا تو بھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ بندہ ہے خاصا ڈیشنگ اینڈ برلیمنٹ۔ پڑھائی سے لے کر ایکسٹرا ایکٹوٹیز تک ہر میدان میں موصوف نے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں اور یوں محترم عارض کے بعد تمہارے آئیڈیل سے مطابقت رکھنے والی دوسری شخصیت ہیں۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے آخر میں اس نے شرارت سے ایک بار پھر پٹڑی بدلی تو مہر نے مسکراتے ہوئے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"بکواس بند کرو اور اگر اتنا ہی اچھا ہے تو میری طرف سے تمہیں ہی مبارک ہو محترم رضا احسان بمعہ اپنی چھچھوری حرکات کے۔"

"اچھے خاصے ڈیسنٹ بندے کو چھچھورا تو نہ کہو یار۔ ہاں عقل اور آنکھ دونوں کا اندھا کہنا چاہو تو کہہ سکتی ہو۔"

"اندھا کیوں بھئی؟" اس کے لہجے اور انداز پہ غور کیے بنا اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ محترمہ مہر رحمٰن! اس معیار عقل اور صورت کے پیچھے خوار ہونے والا عقل اور آنکھ کا اندھا ہی کہلائے گا نا!" شرارت سے اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی گئی تو اگلے ہی پل وہ تکیوں اور کشنز سے اس پر پل پڑی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم یا عزیزی!" گیٹ کھولنے پہ جو چہرہ مہر کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا اس نے صبح ہی صبح اس کا موڈ آف کر ڈالا جبکہ مقابل اپنے مطلوب کو اتنی جلد پا کر اندر تک سرشار ہو اٹھا تھا۔

"تمہیں اتنی صبح بھی اپنے گھر میں چین نہیں؟" دروازہ چھوڑتے ہوئے وہ پلٹ کر دوبارہ کیاری کے پاس بیٹھتے ہوئے مصروف عمل ہو گئی۔

"ہم پیار میں جلنے والوں کو چین کہاں ہائے آرام کہاں......" گنگناتے ہوئے وہ قریبی لان چیئر پر گر سا گیا اور ایک گہری نظر خاموشی سے گوڈی کرتی مہر پر ڈالی۔

"دن بہ دن گندی بچی بنتی جا رہی ہو۔ پہلے سلام کا جواب ندارد اور اب دیکھو کیسے منہ پھلائے مہمان کو لفٹ کرائے بغیر مٹی سے کھیلنے میں مصروف ہو۔"

"پہلی بات تو یہ کہ چوبیس گھنٹے سر پہ سوار رہنے والے مہمان نہیں ہوتے بلکہ......"

"بلکہ دل و جان ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو چوبیس گھنٹے آپ کے قریب' آپ کے پاس ہوں وہ آپ کے دل اور جان ہی تو ہوتے ہیں۔ کیوں صحیح کہا نا؟" تیزی سے اس کی بات اچکتے ہوئے اس نے اپنا فلسفہ بیان کیا تو وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی نہیں۔ بالکل غلط کہا کیونکہ جو چوبیس گھنٹے بلا ضرورت اور اجازت سر پہ سوار رہتے ہیں وہ دل و جان نہیں بلکہ وبال جان ہوتے ہیں۔"

"چلو کچھ تو ہوتے ہیں نا!" نیم وا آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے وہ معنی خیزی سے بولا تو مہر تلملا کر لان کے دوسرے کونے میں لگے نل کی جانب بڑھ گئی۔

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ ہاتھ پاؤں دھو کر واپس آئی تو شاہ میر کے نارمل انداز پہ اس نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم سناؤ آج آفس نہیں جانا کیا؟" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بھی عام سے لہجے میں پوچھا۔

"جانا ہے لیکن ذرا لیٹ اور تم یونیورسٹی کب سے جوائن کر رہی ہو؟"

"کل سے' ویسے شاہی کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم پہلے اپنی تعلیم مکمل کرتے اور پھر بزنس کے جھمیلوں میں پڑتے۔" اسے جواب دیتے ہوئے مہر نے ہمیشہ کی طرح افسوس کا اظہار کیا۔ اسے شاہ میر کے بی بی اے کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہہ کر شاہ زر کے ساتھ آفس جوائن کرنے کے فیصلے سے پہلے دن سے ہی اختلاف رہا تھا۔

"کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ بہتر فیصلہ وہی ہوتا ہے۔ جو بروقت ہو۔ سو مجھے بھی یہی لگا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب مجھے بھائی کے ساتھ ذمہ داریوں کو شیئر کر کے ان کا برڈن کم کرنا چاہیے۔ ایک عرصے سے وہ تنہا ہی تمام فرائض سنبھالے ہوئے تھے لہٰذا اب یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں بنا کسی کے کہے اپنی ذمہ داریوں کو از خود محسوس کروں اور ان کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کروں۔" پہلی بار اس بات کو مذاق میں ٹالنے کے بجائے اس نے پوری سنجیدگی سے اپنے عمل کی وضاحت کی تو ہر مسئلے کو چٹکیوں میں اڑانے والے شاہ میر کی شخصیت کا یہ بردبار اور سمجھ دار روپ اسے حیران کر گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ میرے سر پہ سینگ نکل آئے ہیں کیا؟" مہر کی حیران نگاہیں خود پر مرکوز پا کر اسے

مسکراتے ہوئے ٹوکا۔

"سینگ نکل آتے تو شاید مجھے اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی تمہاری بات سن کر ہوئی ہے۔ تمہاری سوچ کے اس میچور انداز نے مجھے حقیقتاً "متاثر کیا ہے۔" لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ ستائشی لہجے میں بولی تو اس کے انداز پہ شاہ میر کھل کر ہنس دیا۔

"محترمہ! اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ۔ جس طرح سمندر کی گہرائی کا اندازہ ساحل پہ کھڑے ہو کر نہیں لگایا جا سکتا بالکل اسی طرح ایک انسان کی شخصیت کا درست تجزیہ اس کے رویوں سے نہیں کیا جا سکتا وہ کہتے ہیں نا کہ۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

ویسے بھی آپ کے عارض صاحب کے علاوہ اس دنیا میں اور بھی لوگ ہیں جو تھوڑی بہت عقل رکھتے ہیں۔" آخر میں حیرت کی زیادتی سے گنگ بیٹھی مہر کو اس نے قصداً "چھیڑا تو وہ جیسے حواسوں میں لوٹ آئی۔

"شاہ میر تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ایسی گہری باتیں اور وہ بھی شاہ میر کے منہ سے؟ وہ جیسے بے ہوش ہونے کو تھی۔

"طبیعت ہی تو ٹھیک نہیں ہے میری۔ پھر کیا کہتی ہو بھیجوں امی کو؟" لبوں پر مچلتی شریر مسکراہٹ کو دبائے وہ آگے کو جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا تو اسے ایک بار پھر پٹڑی سے اترتا دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم صحیح کہتے ہو، تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں۔" تڑخ کر کہتے ہوئے وہ اندر کی جانب چل دی تو شاہ میر کا بے ساختہ قہقہہ گونج اٹھا۔

مہر کے اس جلے بھنے روپ نے جہاں اسے ہمیشہ کی طرح مزا دیا تھا وہیں بے اختیار ہی اس کی نظروں کے سامنے وہ ناقابل فراموش پل روشن کر ڈالے تھے جب وہ اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت جذبے سے آشنا ہوا تھا۔

اسے آج بھی اوائل اکتوبر کی اس گلابی اور ٹھنڈی مہکی شام کا ہر لمحہ، ہر منظر یاد تھا جب اچانک اس کی زندگی میں ایک نئے رشتے اور احساس نے جنم لیا تھا اور وہ بھی اس ہستی کے حوالے سے جس کے ساتھ کھیلتے کودتے، ہنستے اور لڑتے ہوئے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے حسین اور اہم ترین رشتہ جوڑ بیٹھے گا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ مہر اس سے پورے دو سال بڑی تھی۔

لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ محبت شکل و صورت، ذات پات اور عمر کی پابند نہیں ہوا کرتی، سو کچھ یہی صورت حال اس کے معاملے میں بھی دو سال پیشتر اس روز اچانک پیدا ہو چلی تھی جب وہ ایک دن جم سے واپسی پہ بائیک کے ہلکے پھلکے ایکسیڈنٹ کی بدولت بازو سے بہتے خون سمیت انکل رحمٰن کے گھر چلا آیا۔ جہاں اس کا اتفاقاً "سامنا لاؤنج میں لاپروائی سے لیٹ کر میگزین پڑھتی مہر سے ہو گیا۔

ٹی شرٹ میں سے جھانکتے بازو اور اس سے بہتے خون پر نظر پڑتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"او مائی گاڈ! یہ، یہ چوٹ کیسے آئی شاہی؟" تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے پریشانی سے استفسار کیا تو وہ درد کی شدید ٹیسوں کو دباتے ہوئے بظاہر نارمل سے لہجے میں بولا۔

"بس یار، وہ ذرا جم سے واپسی پہ بائیک کا معمولی سا ایکسیڈنٹ....."

"کیا تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ اگلے ہی پل سینے پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ چلائی تو شاہ میر پلٹ کر اندر کی جانب دیکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں بولا۔

"پلیز، پلیز مہر! شور تو مت مچاؤ یار۔"

"کیا کہا شور نہ مچاؤں! ذرا اپنا بازو دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ شور مچانے کے بجائے اگر تم فرسٹ ایڈ باکس لے آؤ تو تمہاری مہربانی ہو گی۔" جھنجلا کر کہتے ہوئے وہ صوفے پر گر سا گیا تو وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور اگلے چند سیکنڈ میں فرسٹ ایڈ باکس سمیت اس کے سرہانے آ بیٹھی۔

"زخم پر لگاؤ یار!" اسے تذبذب کے عالم میں اسپرٹ میں بھیگی روئی زخم کے اردگرد پھیرتے دیکھ کر اس نے بے اختیار جھنجلا کر ٹوکا تو چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کپکپاتے ہاتھ سے روئی زخم پر رکھ دی۔

بے اختیار ہی سی کی آواز کے ساتھ شاہ میر نے سر پیچھے ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

"شاہی! آر، آر یو آل رائیٹ؟" اس کے درد سے سفید پڑتے چہرے کو تکتے ہوئے وہ رک کر پریشانی سے پوچھنے لگی تو شاہ میر نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ جہاں نظروں کے عین سامنے بلیک اینڈ ریڈ سوٹ میں ملبوس دوپٹے سے بے نیاز مہر رحمٰن اس کے اتنے نزدیک تھی کہ وہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اس کے گلاب چہرے کو چھو سکتا تھا۔ جس پہ پھیلے شاہ میر کی ذات کے لیے، پریشانی اور اضطراب کے رنگ اسے ایک عجیب سی جاذبیت عطا کر رہے تھے۔ نجانے کیوں لیکن اسی پل وہ اپنی ساری تکلیف، سارا درد ایک لمحے کو بھول سا گیا۔

"شاہی!" مہر نے دوبارہ پکارتے ہوئے اس کے دوسرے بازو کو ہلکا سا ہلایا تو وہ جیسے خود میں لوٹ آیا۔

بے اختیار سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے اس نے حیران پریشان سی مہر کی تسلی کروائی تھی۔ جو اس یقین دہانی کے بعد ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھی۔ جب کہ شاہ میر اب پوری طرح آنکھیں کھولے اس کی جھکی ہوئی لمبی لمبی پلکوں اور گلابی لبوں کو تکتے ہوئے اس کے ٹھنڈے نرم ہاتھوں کا لمس اپنے بازو پر محسوس کر رہا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب محبت کا نرم کومل احساس اس کی روح میں سرائیت کر گیا، کچھ اس طرح سے کہ وہ بے خود سا ہو کر اسے پکار بیٹھا۔

"مہر!"

"ہوں.....؟" پٹی کو گرہ لگاتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"تم ہم اب تک کہاں تھیں؟"

"ہیں؟ دماغ پہ بھی چوٹ آئی ہے کیا؟ یہیں تو تھی۔" سر اٹھا کر گھورتے ہوئے وہ تڑخ کر گویا ہوئی تو شاہ میر جیسے ہوش میں آ گیا۔ آن واحد میں اس نے خود کو سنبھال کر مہر کی جانب دیکھا تھا جو اس کی موجودہ کیفیت سے بے نیاز اب سامان سمیٹتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"ذرا واپس آنے دو آج آنٹی، ماہم اور شاہ زر بھائی کو نہ تمہاری اس منحوس بائیک کو آگ لگوائی تو کہنا۔" کھٹاک سے ڈبا بند کرتے ہوئے اس نے شاہ میر کی جانب دیکھتے ہوئے دھمکی دی تو اس کے اپنائیت بھرے انداز پہ وہ اندر تک سرشار ہو اٹھا۔

"سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔"

"ہیں؟ مجھے لگتا ہے تمہارے دماغ پہ واقعی چوٹ آ گئی ہے۔" عجیب سے جواب اور انداز پہ، مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا گیا تو اب کے وہ کھل کر ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"دماغ پر نہیں دل پر۔"

"دل پر؟" حیرت سے استفسار کیا گیا۔

"جی محترمہ دل پر اور یہ چوٹ لگانے کا بہت بہت شکریہ!" کورنش بجالاتے ہوئے وہ تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گیا تو حیران پریشان سی مہر کتنی ہی دیر اس کی بات پر غور کرتی رہی۔ مگر جب کچھ بھی پلے نہ پڑا تو دوبارہ میگزین میں گم ہو گئی۔

اس حادثے کے بعد مہر کی ذات اور زندگی پر تو کوئی اثر نہ پڑا لیکن شاہ میر ابراہیم کی ہستی اور زندگی دونوں ہی پلٹ کر ایک یکسر مختلف مدار پر گردش کرنے لگیں۔ ایک ایسا مدار جس کا محور اور مرکز مہر رحمٰن تھی۔ وہ مہر رحمٰن جس کی ایک لمحے سے شروع ہونے والی محبت اب پھیل کر اس کے جسم میں خون کی طرح گردش کرنے لگی تھی۔ گزرتے وقت نے جہاں اس کی اس محبت میں بے پناہ اضافہ کیا تھا وہیں اسے اپنے مقصد میں مضبوطی اور جرأت اظہار بھی عطا کی تھی۔ جس کی بدولت وہ آج بھی مہر کے مسلسل انکار اور پہلو تہی کے

باوجود، اپنی جگہ پر پورے اعتماد سے کھڑا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ جلد یا بدیر وہ مہر رحمٰن کے دل اور روح کو بالکل اسی طرح فتح کر ڈالے گا جس طرح اس نے شاہ میر ابراہیم کی ذات اور جذبات کو فتح کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوز می رضا صاحب!" اپنے سامنے کھلی کتاب بند کرتے ہوئے اس نے قدرے فاصلے پہ کرسی سنبھالتے رضا احسان کو اچانک مخاطب کیا تو اس انہونی پہ وہ حیرت کے باعث چونک اٹھا۔

"جی!"

"کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟" اس کے دوست پہ نظر ڈالتے ہوئے مہر نے انتہائی سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"آپ کو احساس دلانے کے لیے۔" بنا کسی ہچکچاہٹ کے جواب موصول ہوا۔

"کس بات کا احساس؟"

"اپنی محبت کا۔" مہر کے چہرے پہ نگاہیں جمائے نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں اس نے اپنی بات مکمل کی تو مہر کے ساتھ ساتھ ماہم بھی اس کے واشگاف الفاظ اور نڈر انداز پہ اچھل کر رہ گئی۔

"مسٹر رضا احسان! اپنی حد میں رہیے۔ میں نے تو آپ کو ایک سلجھا ہوا شریف آدمی سمجھ کر مناسب طریقے سے آپ کی غلط روش کا احساس دلانا چاہا تھا۔ مگر مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ شرافت تو دور کی بات آپ کو تو لڑکیوں سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے۔" لائبریری کے ڈسپلن کا خیال رکھتے ہوئے وہ دھیمے مگر انتہائی سخت لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اٹھ کر باہر کی جانب چل دی، تو بہادری کے اس عظیم مظاہرے پہ ماہم عش عش کرتی اس کے ساتھ چل دی۔

"ایکسکیوز می، مس مہر!" چند لمحوں بعد اپنے پیچھے تیز قدموں کی آہٹ اور پکار پہ نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں کو ٹھہرنا پڑا۔

"جی فرمایئے؟" پیشانی پہ تیوریاں چڑھائے اس نے مقابل کو کڑی نگاہوں سے دیکھا۔

"میں اپنے کچھ دیر پیشتر کے رویے پہ شرمندہ ہوں۔ آپ پلیز ایک مرتبہ اطمینان سے کہیں بیٹھ کر میری بات سن لیجیے۔ یوں راستے میں کھڑے ہونا کچھ مناسب نہیں لگتا۔" چہرے پہ خجالت کے رنگ سجائے اس نے اب کے شائستگی سے درخواست کی تو مہر نے بے اختیار ماہم کی جانب دیکھا۔ ایک آدھ منٹ کی پس و پیش کے بعد دونوں چند سیڑھیاں اترتی ہوئی لائبریری کے سامنے پھیلے وسیع و عریض لان میں ایک جانب آ کھڑی ہوئیں۔

"جی کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"سب سے پہلے تو میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں اپنے انداز پہ۔ میرا انداز واقعی غیر مناسب تھا مگر میرے الفاظ نہیں۔ اپنے الفاظ پہ مجھے کوئی شرمندگی نہیں کیونکہ یہی سچ ہے۔ آپ وہ واحد لڑکی ہیں جس نے مجھے اس حد تک متاثر کیا ہے کہ میں ہر مصلحت بھلائے محض اس لیے یہ حرکت کر بیٹھا کہ آپ کی توجہ حاصل کر سکوں۔ میں چاہتا تو پہلے ہی روز آپ سے ڈائریکٹ بات کر سکتا تھا۔ مگر آپ کی سنجیدگی اور لیے دیے انداز نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا کہ پہلے میں آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاؤں، اس بات کی طرف متوجہ کروں کہ کوئی ہے جو آپ کی ایک نظر کے انتظار میں اپنا آپ بھلا بیٹھا ہے۔

اور آج جب بالآخر میں آپ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ میں آپ کو اپنے دل کی گہرائی اور روح کی تمام تر سچائی کے ساتھ چاہنے لگا ہوں۔" ان کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے اس نے مناسب الفاظ میں اپنی غلطی سے لے کر محبت تک کا اعتراف بغیر کسی جھجک کے کر ڈالا تو بے اختیار ایک طنزیہ مسکراہٹ مہر کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"اور اپنے دل اور روح کے اس اختراع کو آپ نے محبت کا نام دے دیا محض پندرہ دن میں؟ کتنی حیرت کی بات ہے۔"

"مس مہر! محبت دن، مہینوں یا سالوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو ایک احساس، ایک ادراک کا نام ہے جو کسی وجدان کی صورت لمحوں میں دل و روح پہ نازل ہو کر اپنے وجود کا پتا دے ڈالتی ہے بقول خلیل جبران "محبت سالوں تک ہمارے اندر پنپتی رہتی ہے اور ہم اس سے لاعلم رہتے ہیں لیکن پھر ادراک کا ایک لمحہ آتا ہے اور یہ ہم پر کھلتی چلی جاتی ہے۔" سو پندرہ دن کے اس اختراع کو اگر میں نے محبت کا نام دے ڈالا تو اس میں حیرت یا تعجب کا تو کوئی پہلو نہیں نکلتا۔" گمبھیر لہجے میں مہر کے طنز کا جواب دیا گیا تو وہ ایک لمحے کو اس کے خوب صورت الفاظ اور انداز میں کھو کر لاجواب سی ہو گئی۔

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" چند پل کی خاموشی کے بعد اس نے استفسار کیا تو لہجے میں پہلی سی تلخی مفقود تھی۔

"محبت کے اس سفر میں آپ کے ساتھ کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ کا جواب "ہاں" میں ہو گا تو میری خوش بختی ہو گی اور اگر نہیں تو بھی کوئی گلہ نہیں کیونکہ میری چاہت کسی شرط سے مشروط نہیں۔ میں نے ہاں یا نہ سے بے بہرا ہو کر چاہا ہے آپ کو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ میرے جذبات سے لاعلم نہیں رہیں۔" دھیمے مگر مضبوط لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مخالف سمت میں بڑھتا چلا گیا تو اب تک خاموش تماشائی بنی ماہم نے ایک گہرا سانس لیا۔

"یار! یہ رضا احسان تو حد سے زیادہ اسٹریٹ فارورڈ اور کانفیڈنٹ بندہ نکلا۔ مائی گاڈ! اتنی بڑی بات کتنے آرام سے کہہ گیا۔ میرا دل تو ابھی تک سو میل کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ داد دینی پڑے گی تمہاری ہمت کی۔ ورنہ میں تو سوچ رہی تھی کہ تم اب لڑھکیں کہ تب۔" اپنے دھیان میں بولتے ہوئے اس نے مہر کی جانب دیکھا تو بے اختیار چونک اٹھی۔

"مہر! آر یو آل رائیٹ؟" اس کا برف جیسا ٹھنڈا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے تشویش سے مہر کا چہرہ دیکھا جس پہ گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ سوچ کی پرچھائیاں بھی چھائی ہوئی تھیں۔

"مہر! کیا پوچھ رہی ہوں میں؟" اگلے ہی پل ماہم نے پریشانی سے اس کے ہاتھ کو زور سے ہلایا تو وہ جیسے چونک اٹھی۔

"ماہم! بس، میں گھر جانا چاہتی ہوں پلیز۔"

"ہاں چلتے ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔" اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے ماہم نے تسلی دی۔

واپسی کا تمام راستہ نہایت خاموشی سے کٹا۔ مہر کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ماہم مسلسل خود کو اور اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے، اسے رضا احسان سے کلیئر بات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جبکہ دوسری جانب رضا احسان کے انداز گفتگو میں الجھی مہر کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا "کہیں رضا احسان تو عارض نہیں؟"

اور اپنا یہی خیال جب اس نے ماہم کے سامنے بیان کیا تو وہ کھل کر ہنس دی۔

"شاہی ٹھیک کہتا ہے، تم پریکٹیکل ہونے کے دعوے تو بہت کرتی ہو مگر حقیقتاً "ایسا نہیں ہے۔"

"کیوں؟ میں نے ایسی کون سی انہونی بات کر دی ہے۔ آخر کو وہ بھی اتفاقاً" ہی سہی لیکن اسی شہر میں رہتا ہے اور پھر عارض اس کا قلمی نام ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ رضا احسان ہی عارض ہو۔" ماہم کی بات پہ تپ کر اس نے تیزی سے اپنا دفاع کیا تو وہ بھی چڑ گئی۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ اگر رضا احسان، عارض ہوتا نا تو اب تک پوری یونیورسٹی میں اس بات کا چرچا ہو چکا ہوتا۔"

"تو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ بات سب سے چھپائی ہو۔" اس نے دوبدو جواب دیا تو اب کے ماہم کھول اٹھی۔

"کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں۔ اس قصے کو تو تم رہنے ہی دو۔ اینڈ فار گاڈ سیک اس عارض نامی بھول بھلیوں سے خود کو نکالو۔ حقیقت ان کتابی باتوں سے بہت ہٹ

کر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو اچھا لکھتا ہو وہ خود ویسا اچھا انسان بھی ہو۔"

"ماہم بی بی! آپ شاید بھول رہی ہیں کہ انسان کی تحریر اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔" مسکرا کر اہم حقیقت بیان کی گئی۔

"میں مانتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں عارض کے علاوہ اچھی سوچ رکھنے والے اور بھی بہت سے انسان ہیں۔ تم ہر ایک کی ذات میں کسی اور کے عکس کو کیوں تلاش کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم حقیقت میں سراب کو کھوجتی ہو۔ پلیز مہر! اس فینٹیسی ورلڈ سے باہر آؤ اور میچور بی ہیو کرو۔ ہر شخص کو ایک علیحدہ فرد کے طور پر پرکھنا سیکھو اور اس پرکھ میں ظاہری شخصیت اور اطوار کو اتنی اہمیت نہ دو کیونکہ آنکھوں کا دیکھا اور کانوں کا سنا ہمیشہ سچ نہیں ہوا کرتا۔" ماہم نے نہایت رسان سے ایک اور اہم حقیقت مہر کو سمجھانا چاہی تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

مگر اس کے سمجھانے کے برعکس، مہر رحمٰن اس تیزی سے رضا احسان کی طلسماتی شخصیت کی اسیر ہوئی کہ ماہم چاہ کر بھی روک نہ سکی۔

مہر کی باتوں اور سوچوں کا دھارا بہت غیر محسوس طریقے سے عارض کے بجائے، رضا احسان کی جانب مڑ چکا تھا۔ جو اس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر تھا اور جسے پا کر اس کے گلاب چہرے کی تازگی اور ستارہ آنکھوں کی چمک دوچند ہو چلی تھی۔

مہر کے یہ بدلے بدلے سے انداز بہت جلد شاہ میر کی نظروں میں بھی آگئے، اور چونکہ اس کی شخصیت کا ہر رنگ اس کے دل پر نقش تھا سو اسے یہ بات محسوس کرنے میں دیر نہ لگی کہ مہر کے اردگرد کہیں کوئی غیر معمولی واقعہ ضرور وقوع پذیر ہوا ہے مگر کہاں؟ اس الجھن کا سرا اسے باوجود کوشش کے مل کر نہیں دے رہا تھا اور آج جب بالآخر انتہائی غیر متوقع طور پر یہ گتھی سلجھی تو اس کی ذات کو اس طرح الجھا گئی کہ اپنی تمام تر زندہ دلی اور مثبت طرزِ فکر کے باوجود وہ خود کو زندگی میں پہلی بار دکھ اور یاسیت کے گہرے سمندر سے نکالنے سے قاصر رہا تھا۔

آج مہر کی سالگرہ کے موقع پہ اس نے سرپرائز ڈنر کے ساتھ ساتھ ایک ایسے سرپرائز گفٹ کی بھی تیاری کر رکھی تھی جو مہر کے علاوہ باقی سب کے لیے بھی ایک ناقابل یقین اور بے تحاشا خوب صورت تحفہ ثابت ہونا تھا اور اسی سلسلے میں وہ کئی کام کل پہ ڈالتے ہوئے آفس سے جلد اٹھ کر سیدھا ابراہیم انکل کی طرف چلا آیا، تاکہ منیب اور ماہم کو پروگرام میں شامل کر کے وہ سب مہر کو کسی بہانے گھر سے باہر لا سکیں۔

اپنے دھیان میں گم کی چین گھماتے ہوئے وہ مہر کے کمرے کی جانب بڑے مگن انداز میں بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ادھ کھلے دروازے پہ دستک دیتا اندر سے آتی ماہم کی آواز نے اس کا اٹھتا ہاتھ ہوا میں ہی ساکت کر ڈالا۔

"مہر تمہیں چاہیے تھا کہ اتنا مہنگا تحفہ تم قبول ہی نہ کرتیں۔"

"میں نے بہت کہا تھا یار، مگر میرے اصرار پہ وہ ماننے کے بجائے الٹا مجھ سے ناراض ہونے لگا کہ میں اس کے دیے گئے پہلے تحفے کو قبول نہ کر کے اس کے جذبات اور خلوص کی توہین کر رہی ہوں۔" مہر کی بے بس سی آواز باہر کھڑے شاہ میر تک پہنچی تو نجانے کیوں اس کے تیزی سے ڈوبتے دل نے بے اختیار آنے والے لمحوں کے تھم جانے کی دعا کی تھی۔

"اب ان گولڈ ایئر رنگز کا کرو گی کیا؟" ایک بار پھر ماہم کی تشویش بھری آواز ابھری۔

"ظاہر ہے انہیں پہننے کا رسک تو میں لے نہیں سکتی۔ سو سنبھال کر رکھ دوں گی۔ ویسے بھی یہ میرے لیے بہت قیمتی ہیں کیونکہ ان سے وابستہ جذبات انمول ہیں۔" چھوٹے سے ویلوٹ باکس میں پڑے خوب صورت سے ایئر رنگز کو نرمی سے چھوتے ہوئے وہ بے خودی سے بولی اس کے لہجے میں بولتے نئے ارمانوں نے باہر کھڑے شاہ میر کی آنکھیں آن واحد میں نم کر ڈالیں۔ بے اختیار ہی اس کے دل نے تڑپ کر

دروازے کے اس پار بیٹھے کٹھور وجود سے شکوہ کیا تھا

......

"اور میرے جذبات؟"

"ارے ہاں! یاد آیا کل رات میں شاہی کے ساتھ یونہی تھوڑی دیر کے لیے مارکیٹ تک گئی تو مجھے اس ماہ کا فلک نظر آگیا۔ میں نے تمہارے لیے خرید لیا۔ اس بار تمہارے عارض صاحب کی تحریر بھی شامل ہے۔" ماہم نے بیگ میں سے رسالہ نکالتے ہوئے اپنے تئیں اہم اطلاع فراہم کی تو مہر نے "تھینک یو!" کہتے ہوئے رسالہ لاپروائی سے لے کر ایک طرف ڈال دیا۔

"ہیں! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟" حیرت سے ماہم نے ایک نظر رسالے پر اور دوسری بیڈ سے اتر کر الماری کی جانب بڑھتی مہر پر ڈالی۔

"کیا؟" بے دھیانی سے پلٹ کر پوچھا گیا۔

"یہی کہ عارض کی نئی تحریر کی اطلاع اور مہر رحمٰن کی یہ بے نیازی۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟" ماہم نے اپنے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے شرارت سے کہا تو مہر بھی مسکرا دی۔

"بالکل نہیں۔ کیونکہ میں نے حقیقت اور سراب میں تمیز کرنا سیکھ لی ہے اور ویسے بھی اب اس لفاظی میں وہ چارم نہیں رہا جو......"

"جو رضا احسان کی باتوں میں ہے۔" ماہم نے مسکراتے ہوئے تیزی سے اس کی بات اچک لی تو جواباً وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی اس کھلکھلاہٹ میں کسی نے اپنی شکستگی کا روح فرسا پیغام وصول کرتے ہوئے نہایت دکھ بھری نگاہوں سے اس وجود کو کھوجا تھا جو چند ہی دنوں میں بہت بدل چکا تھا۔ اس مہر رحمٰن سے بالکل مختلف اور انجان جسے شاہ میر ابراہیم بچپن سے جانتا اور پہچانتا تھا۔ اندر بیٹھی مہر اس کے لیے ہر لحاظ سے یکسر اجنبی تھی۔ جس سے اب کسی شناسائی کا کوئی امکان، کوئی امید نہ رہی تھی۔ سو نہایت خاموشی سے لڑکھڑاتے قدموں اور تڑپتے دل کے ساتھ وہ آپ اپنی منزل سے لحظہ بہ لحظہ دور ہوتا چلا گیا۔

اور پھر آنے والے دنوں میں ایک نئے شاہ میر ابراہیم نے جنم لیا، جو سوائے مہر رحمٰن کی ذات کے دیگر تمام لوگوں کے لیے تو ویسا ہی ہنس مکھ اور زندہ دل تھا، مگر مہر کے ساتھ اس کا رویہ یکسر بدل چکا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کا اندر تبدیل ہو چلا تھا۔ دل کی ویرانی اور جذبات کی بے قدری نے کچھ اس طرح سے اسے تھکا ڈالا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس دشمن جاں کو معاف نہیں کر پا رہا تھا جو اس کی ذات اور روح کی قاتل تھی۔

مہر کو دیکھتے ہی نارسائی کا دکھ ہر مصلحت اور دور اندیشی پر اس طرح سے حاوی ہوتا کہ اس کی ذات اور آنکھیں دہک اٹھتیں۔ اور خود وہ ان شعلوں کی لپک کو قابو کرتے کرتے نڈھال ہونے لگتا، جو اگر ذرا مزید بھڑک اٹھتے تو اپنی لپیٹ میں رشتے، پیار محبت، خلوص ہر چیز لیتے ہوئے اسے اس کی ہی نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گرا ڈالتے، جو کہ اسے کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔

شاہ میر ابراہیم محض ایک محبت اور ایک رشتے کی چاہ میں اپنے باقی رشتوں اور محبتوں کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ سو بہت خاموشی سے اس ہستی سے دور رہنے لگا جسے دیکھ کر کبھی آنکھوں کے رستے ٹھنڈک روح تک سرائیت کرتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھانے پڑتے۔

جب کہ دوسری جانب اس کی تمام تر تکالیف اور کوششوں سے بے نیاز، نئی دنیا کی سیر کو نکلی مہر رحمٰن اپنی خواہشوں کی رنگین تتلی کے پیچھے بھاگنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے شاہ میر کے بدلتے رویوں کا احساس تک نہ ہوا۔ اسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ کب ایک بہت پیار کرنے والے دل نے اپنا ہر ارمان، ہر رشتہ، اس کی خوشی کو مقدم جانتے ہوئے نہایت چپکے سے توڑ ڈالا۔ محض چند چمکتے جواہر کے پیچھے کب وہ نادانی میں اپنی دسترس میں موجود بیش بہا خزانے کو کھو بیٹھی اسے پتا ہی نہ چلا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے زعم میں تھا کہ بے خبر رہا مجھ سے اسے خبر نہیں کہ میں نہیں رہا اس کا

"مہر بیٹا! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟" موبائل پہ رضا احسان کا میسج پڑھتی مہر نے اپنے دھیان میں جوں ہی لاؤنج میں قدم رکھا' آصفہ بیگم کے حیرت سے پوچھے گئے سوال نے اسے بے اختیار چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"تیار؟ لیکن کس لیے امی؟" نک سک سے درست آصفہ بیگم کو الجھن بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے اب کے اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب ہے' کس لیے کیا تمہیں نہیں پتا کہ آج شاہ زر کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے نازش کے گھر جانا ہے۔" سخت لہجے میں یاددہانی کروائی گئی تو وہ اپنی بھول پر خود کو کوس کر رہ گئی۔

"اوہ مائی گاڈ! میں تو بالکل بھول گئی تھی امی۔" لبوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے شرمندہ سے لہجے میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو آصفہ رحمٰن یک لخت کھول اٹھیں۔

"کیا ہو گیا ہے مہر تمہیں؟ آج کل تمہارا دھیان کہاں رہتا ہے؟ آخر ایسی کون سے مصروفیات چند دنوں میں پیدا ہو چلی ہیں کہ نہ تم گھر والوں کو ٹائم دے پا رہی ہو اور نہ کسی اور کو۔ سب تمہاری شکل دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یونیورسٹی کے بعد سارا وقت کمرے میں گھسی تم کرتی کیا رہتی ہو؟" موقع ملتے ہی انہوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تو وہ محض منمنا کر رہ گئی۔

"آئی ایم رئیلی ویری سوری امی۔ آپ پلیز مجھے دس منٹ دیں کہ......"

"آنٹی! انکل کہہ رہے ہیں کہ تیار ہیں تو نکلنے والی بات کریں۔" اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ تیزی سے اندر داخل ہوتا شاہ میر' رحمٰن صاحب کا پیغام لیے چلا آیا۔

"کیسے چلوں؟ نواب زادی بھولی بیٹھی تھیں کہ آج نازش کے گھر جانا ہے۔ اب یاد دلایا ہے تو تیار ہونا سوجھا ہے۔" غصے سے اسے گھورتے ہوئے وہ کلس کر بولیں تو شرمندہ سی کھڑی مہر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"آنٹی! انہیں آج کل اپنی خبر نہیں تو بھلا یہ دوسروں کی خوشی غمی کا کیا خیال رکھیں گی۔" ایک نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ڈالتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا تو مہر اسے نظر انداز کرتے ہوئے ماں سے مخاطب ہوئی۔

"امی! آپ صرف مجھے دس منٹ دیں۔ میں یوں گئی اور یوں آئی۔" چٹکی بجاتے ہوئے وہ اندر کی جانب بھاگی تو آصفہ بیگم ایک گہری سانس لیتے ہوئے صوفے پر ٹک گئیں جبکہ شاہ میر غیر ارادی طور پہ اس نادیدہ ہستی کے بارے میں سوچے چلا گیا' جس نے مہر پر دنوں میں نہ جانے کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ وہ خود اپنے آپ تک کو بھلا بیٹھی تھی۔

بے اختیار ہی اسے اس شخص سے سخت حسد اور جلن محسوس ہوئی تھی جس نے بنا کسی مقابلے کے بازی پلٹتے ہوئے اسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی شکست سے دوچار کر ڈالا تھا۔

اور شکست سے دوچار تو مہر رحمٰن کو بھی ہونا پڑا تھا۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ خواہشوں کا دھنک رنگ لبادہ اوڑھے اس شکست کو اس نے بخوشی اپنے ہاتھوں سے اپنے مقدر میں رقم کیا تھا۔ اس دھوکے پر کہ اسے اس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر مل گئی۔ مگر خوابوں کی اچانک ملنے والی یہ حسین تعبیر' اچانک ہی اپنے معنی کھو دے گی اس حقیقت کا اسے ہرگز علم نہ تھا۔

اور جب بالآخر علم ہوا تو خالی ہاتھ اور خالی دل نے اسے اس بات کا احساس دلایا کہ وہ کتنے گھاٹے کا سودا کر چکی تھی۔ کتنی ہی دیر سناٹے کی کیفیت میں گھری وہ اپنی ہی سماعتوں پر شبہ کرتی رہی۔ مگر جوں ہی روح پر کوڑے کی مانند برستے لفظوں نے سنسناتے دماغ تک رسائی حاصل کی' اس کی ذات کا غرور اور افتخار لمحوں

میں چکنا چور ہوتا چلا گیا۔

اس سے دیوانگی کی حد تک عشق کا دعوا کرنے والا' اس کی عزت اور مان کی خاطر جان تک قربان کر دینے کا عزم رکھنے والا' شیریں لہجے میں محبت پہ گھنٹوں گفتگو کرنے والا' رضا احسان اس کی غیر موجودگی میں یوں اپنے کہے الفاظ اور اس کی ذات کی دھجیاں اڑاتا ہو گا' اس کا اسے اندازہ نہ تھا اور شاید اندازہ ہوتا بھی نہ اگر وہ آج معمول سے ہٹ کر' جلدی یونیورسٹی نہ چلی آتی۔

آج ماہم کی طبیعت خرابی کے باعث وہ اکیلی ہی یونیورسٹی چلی آئی تھی اور آتے ہی سیدھی لائبریری میں جا بیٹھی' تاکہ اپنے اور ماہم کے چند اہم نوٹس مکمل کر سکے۔

کتابوں میں سر دیے' کتنی ہی دیر وہ اردگرد سے بے خبر اپنے کام میں مصروف رہی جب اچانک شیلف کے دوسری جانب سے ابھرنے والی قدرے اونچی آواز نے اس کا تیزی سے چلتا قلم روک ڈالا۔

"یار! یہ مہر صاحبہ تو تیرے گلے کا ہار ہی بن کر رہ گئی ہے۔ عجیب لسوڑہ ٹائپ لڑکی ہے۔ مجھے تو اس کی شکل دیکھ کر ہی کوفت ہونے لگتی ہے۔ نہ جانے تو کیسے اب تک برداشت کیے ہوئے ہے۔"

جھنجھلائی ہوئی اس آواز کو وہ بخوبی پہچانتی تھی۔ یہ آواز رضا کے دوست محسن کی تھی۔ ہاں لیکن یہ ہتک آمیز لب و لہجہ اور گھٹیا انداز گفتگو اس کے لیے نیا اور قطعی اجنبی تھا۔ اس سے پہلے اس کی سماعتوں تک جب بھی یہ آواز پہنچی تھی ہمیشہ عزت' احترام کے رنگ میں ڈوبی ہی پہنچی تھی۔ لیکن اب جو کچھ اس نے سنا تھا وہ اسے چند لمحوں کے لیے گنگ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

"نہیں یار' اب اتنی بھی ناقابل برداشت نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔" رضا کی ہنسی میں ڈوبی آواز ابھری۔

"خیر تو ہے سرکار! بڑی سائیڈ لی جا رہی ہے۔ کہیں محبت تو نہیں کر بیٹھا؟" اب کے اظہر کی شرارت سے بھرپور آواز ابھری تو دوسری جانب نجانے کس آس کے تحت مہر کا پورا جسم کان بن گیا۔

"محبت؟ اور وہ بھی مہر رحمٰن سے؟ ہاؤ فنی! ابھی رضا احسان کے اتنے برے دن نہیں آئے کہ محض چند ڈائیلاگز پہ پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں گرنے والی لڑکیوں سے محبت کر بیٹھے۔" حیرت کے اظہار کے بعد طنزیہ لہجے میں شانِ تفاخر سے آخری جملہ ادا کیا گیا تو مہر کو لگا جیسے کوئی تیز رفتار ٹرین اس کے وجود کے پرخچے اڑاتی گزر گئی ہو۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تو کیوں اسے اب تک لیے لیے پھر رہا ہے۔ حالانکہ یاسر سے لگائی گئی شرط کی مدت پوری ہوئے بھی اب تو ایک مہینہ گزر گیا۔" محسن کے ذریعے ایک نئی روح فرسا اطلاع مہر تک پہنچی تو اس کا ہاتھ' بے اختیار ابھرنے والی سسکیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے مضبوطی سے لبوں پر جم گیا۔

"یار میرے' میں اسے اب تک اس لیے' لیے لیے پھر رہا ہوں کیونکہ فی الحال مجھے اس سے بہتر "پیس" پوری یونیورسٹی میں نظر نہیں آیا اور جوں ہی کوئی نیا چاند چہرہ میری نظروں میں سمایا' مہر رحمٰن کی ذات قصۂ پارینہ بن جائے گی۔" شائستگی سے گفتگو کرنے والے رضا احسان نے خباثت سے ہنستے ہوئے عامیانہ لب و لہجے میں اپنے انتہاؤں کو چھوتے عشق کی وجہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں مہر کا مقام بھی طے کر ڈالا تو وہ ہر مصلحت سے بے نیاز' وہیں میز پر سر رکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی۔

گھائل روح' بکھرتے اعصاب اور لہو لہو جذبات کے ساتھ یونیورسٹی سے نکل کر وہ کب اور کیسے گھر تک پہنچی اسے کچھ یاد نہ تھا اور جب بالآخر تین دن اور تین راتیں بخار میں جلنے کے بعد ہوش و خرد کی دنیا سے تعلق استوار ہوا تو وہ ماہم کے سینے سے لگ کر کچھ اس طرح بکھر کر روئی کہ اسے سنبھالتے سنبھالتے خود ماہم بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی بہنوں سے بڑھ کر عزیز دوست کے لیے سوائے رونے کے کچھ نہ کر سکتی تھی جس نے اپنی جان کا واسطہ دے کر اسے رضا احسان سے کسی بھی قسم کی باز پرس سے

یے منع کر ڈالا تھا کہ اسے اپنی ذات، ر سب سے بڑھ کر عزت کا، ایک انسانیت رے ہوئے انتہائی گھٹیا اور کم ظرف انسان سے، رید تماشا بنوانا منظور نہ تھا۔ ویسے بھی جو ذلت اور جو رسوائی اس نے تنہا اپنی ذات پہ جھیلی تھی اس کی سارے زمانے میں تشہیر اسے مر کے بھی قبول نہ تھی اور یہی وہ مقام تھا جہاں آ کے ماہم خود کو ہر طرح سے بے بس اور لاچار محسوس کرتی۔ ورنہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ بھری یونیورسٹی میں رضا احسان کی ایسی طبیعت صاف کرتی کہ وہ آئندہ کبھی بھول کر بھی محبت کے نام پر اذیتوں اور رسوائیوں کا یہ گندہ کھیل نہ کھیلتا۔

مگر چونکہ مہر کی عزت، اس کے احساسات اور اس کا سکون ماہم کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر تھے سو وہ بہت خاموشی سے رضا کی اس کمینگی پہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی، جس کے ہاتھوں مہر یونیورسٹی تک چھوڑ بیٹھی تھی۔

مہر کی اچانک بیماری اور اس کے بعد پڑھائی سے کنارہ کشی کے اس فیصلے نے جہاں سب کو حیران پریشان کیا وہیں اس کی گرتی ہوئی صحت اور خاموشی نے سب کو ایک نئی تشویش میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ ہر ایک نے اپنے طور پر اس کی پریشانی اور اس انتہائی فیصلے کی وجہ جاننے کی بہت کوشش کی مگر جب ہر کسی کو ایک ہی جملہ سننے کو ملا "بس اب میرا دل نہیں کرتا" تو سب ہی نے تھک کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس سارے قصے میں اگر کسی کو کچھ پوچھنے یا جاننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی تو وہ تھا شاہ میر ابراہیم — مہر رحمٰن کی ہر لحہ نم، یاسیت میں ڈوبی آنکھوں اور سوچوں میں گھرے وحشت زدہ وجود نے کچھ اس طرح سے حال دل بیان کیا تھا کہ اسے کسی اور سے تو کیا خود مہر سے بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ وہ مہر، جو اس واقعے کے بعد آج نہ جانے کتنے مہینوں کے توقف سے شاہ میر کو اپنے سامنے، سینے پہ ہاتھ باندھے، خاموشی سے خود کو تکتے پا کر کتنے ہی پل سر اٹھائے بے اختیاری میں ان آنکھوں کو دیکھتی چلی گئی تھی، جن کا تاثر اور خالی پن اسے کسی اور کی آنکھوں کی یاد دلا رہا تھا۔ مگر کس کی؟ بالآخر تھک کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سوال کا جواب سامنے پا کر ایک لمحے کو سن سی ہو گئی جہاں آئینے میں اس کا اپنا عکس اور عکس میں ابھرنے والی بے تاثر دکھ میں ڈوبی خالی آنکھوں نے یکایک شاہ میر کی آنکھوں کا روپ لے لیا تھا۔

دم سادھے کتنی ہی دیر وہ ایک ٹک شیشے میں ان زخمی آنکھوں کو دیکھتی رہی جن سے ٹپکنے والی نارسائی اور یاسیت خود مہر رحمٰن کی عطا کردہ تھی۔ پھر بھلا اس کی اپنی آنکھیں خوابوں کی خوشنما تعبیر کیونکر پا سکتی تھیں۔ آگہی کے در وا ہوئے تو احساس ہوا کہ کتنی بے دردی اور بے حسی سے بنا پرکھے، بنا سمجھے سچی محبت سے لبریز ایک دل اس نے محض آئیڈیلزم کے نام پہ قدموں تلے روند ڈالا اور پھر پلٹ کر ایک بار بھی یہ دیکھنے یا جاننے کی کوشش نہ کی کہ اس کے اتنے ظالمانہ سلوک کے بعد اس وجود کا کیا بنا جس میں وہ ارمانوں بھرا دل دھڑکا کرتا تھا۔

یکایک آئینے میں نظر آنے والا اس کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا، اتنا کہ بے اختیار مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ آج دامن میں محض پچھتاوؤں، دکھ اور شرمندگی کے دوسرا کوئی احساس نہ تھا اور یہ سب اسے یہ باور کروانے کے لیے کافی تھا کہ وہ کتنے گھاٹے کا سودا کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

دکھ، سکھ ہر چیز سے مبرا دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ جبکہ دوسری جانب اس بھاگتے دوڑتے وقت سے بے پروا مہر رحمٰن پہ اب بس ایک ہی دھن سوار تھی، شاہ میر سے اپنے گزشتہ رویے پر معذرت، اس بات سے قطعی لاعلم کہ وہ اسے معاف کرے گا یا نہیں وہ اپنی اذیت اور سزا میں کمی کی شدید خواہش مند تھی۔ مگر شاہ میر کی اس کی ذات سے بے گانگی اس خواہش کی تکمیل میں ایک بڑی رکاوٹ بنی کھڑی تھی۔

شاہ میر اس سے کتنا دور، کتنا لاتعلق اور کتنا بے نیاز ہو چکا تھا اس حقیقت کا ادراک بھی اسے اب جا کر ہوا تھا جب وہ ایک بار پھر اپنوں کے درمیان لوٹنے کی سعی کر رہی تھی۔ سب کے ساتھ پہلے کی طرح ہنسنے والا شوخ اور زندگی سے بھرپور شخص اس کے نزدیک آتے ہی کیسے برف سے ٹھنڈے گلیشیر میں تبدیل ہو جاتا ہے اس بات کا احساس اسے اب اپنی پرانی دنیا میں لوٹ کر ہو رہا تھا۔ جہاں ہر محبت، ہر رشتہ اپنی جگہ پر قائم تھا ماسوائے شاہ میر ابراہیم کے جو اتنی دور جا چکا تھا کہ اس تک رسائی ممکن ہی نہ رہی تھی۔

اور اب اس کے دن رات اسی سوچ میں غلطاں گزر رہے تھے کہ شاہ میر سے اور کچھ نہیں تو معافی طلب کر کے اپنے لیے تھوڑا سا ذہنی اور قلبی سکون ہی حاصل کر لے جو وہ خود اپنے ہاتھوں گنوا چکی تھی۔

رضا احسان کی بے وفائی، اپنی اولین محبت کی بے قدری اور ناکامی، شاہ میر سے کیا گیا اپنا ناروا سلوک اور نتیجتاً اس کی لاتعلقی نے مہر کے دل کو بے تحاشا بوجھل اور اعصاب کو تھکا ڈالا تھا۔ ہمہ وقت لایعنی سوچوں میں گھری وہ دن بہ دن خود سے اور اپنے ماحول سے کٹتی جا رہی تھی اور ایسے میں کب دونوں گھروں میں شاہ زر کی شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر پہنچ گئے اسے پتا ہی نہیں چلا۔

شاہ زر کی شادی کی تیاریاں پچھلے دو ماہ سے جاری تھیں اور ان میں اس کی دلچسپی صفر رہی تھی۔ مگر اب چونکہ تقریب میں محض پندرہ بیس دن ہی رہ گئے تھے سو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ذہن کو جھٹک کر ساری لاتعلقی اور بے زاری پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی گوشہ نشینی ترک کرنا پڑی تھی۔

مہر کو از خود شادی کی تیاریوں اور دیگر مصروفیات میں دلچسپی لیتے دیکھ کر ماسوائے شاہ میر کے، سب ہی نے شکر کا کلمہ ادا کیا تھا اور سب کے درمیان اس کی یہی اجنبیت، یہی بے نیازی مہر کے دکھ کا باعث تھی۔ مگر چونکہ فی الحال سب بے تحاشا مصروف اور مگن تھے سو کسی نے بھی اس غیر معمولی صورت حال پر غور کرنے کی زحمت نہ کی، ورنہ شاید اسے دکھ کے ساتھ ساتھ سب کے سامنے خاصی شرمندگی اور سبکی بھی اٹھانی پڑتی بالکل اسی طرح جس طرح کل اسے شاہ میر کی کزنز اور عزیز ترین دوست کے سامنے اٹھانی پڑی تھی۔

کل ان سب کو نازش کی مہندی لے کر جانا تھی اور چونکہ رسم کے تھال سے لے کر مہندی کی دل کش مٹکیوں اور تھالیوں تک، سب کی سجاوٹ اس نے کی تھی سو اس کی اپنی تیاری خاصی لیٹ ہو گئی تھی۔

افراتفری میں تیار ہو کر جوں ہی اس نے تیز قدموں سے دونوں گھروں کا درمیانی دروازہ عبور کیا نظر سیدھی پورچ میں نکلنے کے لیے تیار کھڑی گاڑیوں پر پڑی۔

"مہر! ادھر آ جاؤ۔" اسے پورچ میں داخل ہوتے دیکھ کر شاہ میر کی گاڑی میں دیگر لڑکیوں کے ساتھ سوار ماہم نے، پچھلی کھڑکی میں سے ہاتھ نکالتے ہوئے اونچی آواز سے مخاطب کیا تو بے اختیار شاہ میر کے کزن اور جگری دوست عمار نے ڈرائیونگ سیٹ کے کھلے دروازے سے بازو ٹکائے خود سے گفتگو کرتے شاہ میر کو شرارت سے ٹہوکا دیتے ہوئے مہر کی جانب متوجہ کیا۔

جو پیلا اور سبز بنارسی کا نفیس سے کام والا چوڑی دار پاجامہ اور قمیص زیب تن کیے، کندن کے بڑے بڑے آویزے پہنے، لائیٹ سا میک اپ اور لمبا سا پراندہ ڈالے تیزی سے قدم اٹھاتی گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل تک پہنچتا، بے تاثر چہرے کے ساتھ اس پہ ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے شاہ میر نے اگلے ہی پل جھک کر بہن کو ٹوک ڈالا۔

"یہاں بھلا کوئی جگہ ہے جو اسے بلا رہی ہو۔"

اور مہر رحمٰن، عمار کے ساتھ ساتھ دیگر لڑکیوں کے سامنے اس عزت افزائی پر سن کھڑی رہ گئی، جبکہ اندر بیٹھی ماہم اس کی حالت سے بے خبر سب کو آگے پیچھے کھسکاتے ہوئے بولی۔

"ابھی بن جاتی ہے جگہ تم ذرا صبر تو کرو۔"

"ماہم، تم رہنے دو، مہر آگے بیٹھ جائیں گی۔"

آنکھوں میں ناچتی شرارت اور لبوں پر مچلتی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے عمار بظاہر نارمل لہجے میں گویا ہوا۔

"کوئی ضرورت نہیں آگے صرف تم بیٹھو گے۔" بغیر کسی لحاظ مروت کے دو ٹوک الفاظ میں منع کرتے ہوئے شاہ میر نے گاڑی میں بیٹھ کر کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا تو اب کے مہر کے ساتھ باقی سب بھی اس کے تلخ لہجے اور انداز پہ ایک پل کو بھونچکارہ گئے۔ عمار الگ اپنی جگہ پر پہلے حیران پریشان اور پھر بے اختیار شرمندہ ہو گیا۔ اتنی بے عزتی اور بدتمیزی پہ مہر کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت تھی۔ یک لخت اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں مگر اس سے پہلے کہ سب کے سامنے اس کا رہا سہا بھرم بھی آنکھوں کے اس پانی کے ساتھ چھلک جاتا وہ اگلے ہی لمحے پلٹی اور تیزی سے قدم اٹھاتی رحمٰن صاحب کی جانب بڑھ گئی۔

اپنے پیچھے اس نے ماہم کی آواز سنی تھی جو اسے پکارنے کے بعد اب بری طرح شاہ میر پر برس رہی تھی۔ مگر مہر کے لیے تو فی الوقت جیسے ہر بات بے معنی ہو چلی تھی۔ اس کا بس چلتا تو ہر مصلحت کی پروا کیے بنا سیدھی اپنے کمرے میں جا کر دم لیتی۔ مگر سب کی خوشیوں اور امی، بابا کی پریشانی کے خیال نے اسے جیسے باندھ سا دیا تھا۔ سارے رستے وہ ضبط کرتی آنے والے لمحوں کے لیے خود کو تیار کرتی رہی جب اسے نہایت کمپوزڈ اور نارمل انداز میں سب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی فیس کرنا تھا جو اس واقعے سے باخبر تھے۔

جونہی ساری گاڑیاں آگے پیچھے چلتے ہوئے دلہن کے گھر کے آگے رکیں، ماہم نے تیر کی سی تیزی سے مہر کے پاس پہنچ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور بے اختیار شاہ میر کے رویے پر معذرت کرتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا اور مہر رحمٰن میں اتنا ظرف اور وسعت تو تھی ہی کہ وہ اتنی محبتوں کی خاطر کسی ایک شخص کی نفرت اور ناراضگی کو خاموشی سے جھیل لیتی۔

☼ ☼ ☼

آج شاہ زر کی بارات تھی اور صبح ہی سے وہ سب بمع رحمان صاحب کے ابراہیم انکل کی طرف موجود تھے۔ جہاں گہما گہمی اور رونق کے ساتھ ساتھ مصروفیت بھی اپنے عروج پر تھی۔ مردوں کا ایک پاؤں گھر کے اندر اور دوسرا باہر تھا جبکہ خواتین گھر میں ٹھہرے مہمانوں کی مہمان داری کے ساتھ ساتھ دلہن کے استقبال اور شام میں کی جانے والی ذاتی تیاریوں میں الجھی ادھر سے ادھر پھرکی بنی گھوم رہی تھیں۔

"مہر بیٹا! اس سے پہلے کہ یہ بل ادھر ادھر ہو جائے اسے شاہی کے کمرے میں رکھ آؤ۔" ناہید آنٹی نے مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا بجلی کا بل اسے تھمایا تو ایک پل کو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

"وہ، وہ آنٹی....."

"کیا ہوا بیٹا؟" اس کی ہچکچاہٹ کو بھانپتے ہوئے انہوں نے حیرت سے پوچھا تو وہ تیزی سے بات بنا گئی۔

"وہ آنٹی، میں کہہ رہی تھی کہ کہیں کمرے میں شاہی کے دوست نہ ہوں۔"

"نہیں جان، ان سب کو ابھی رحمٰن بھائی نے کہیں باہر بھیجا ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔" دلہن والوں کے ہاں جانے والے ڈھیروں ڈھیر میوے اور مٹھائی کو اپنی نگرانی میں پیک کرواتے ہوئے انہوں نے اس کی رکی ہوئی سانس بحال کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی شاہ میر کے کمرے میں چلی آئی۔

اپنے دھیان میں گم رائٹنگ ٹیبل کے دراز میں بل ڈالتے ہوئے جونہی وہ جانے کے لیے پلٹی، اس کا پاؤں نجانے کس طرح سے پڑا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بے اختیار خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے بک ریک کا سہارا لیا اور نتیجتاً کئی کتابیں بمع ایک فائل اس کے قدموں میں پڑی تھیں۔ جھنجلا کر خود کو کوستے اور پاؤں کو مسلتے ہوئے وہ نیچے بیٹھ کر فائل سے بکھرنے والے کاغذات سمیٹنے لگی۔ جب اچانک فل اسکیپ پیپرز کو برابر کرتے ہوئے اس کی نگاہ ان پہ لکھی تحریر سے الجھ گئی۔ جوں جوں اس کی نظریں الفاظ

پر سے پھسلتی چلی گئیں اس کی آنکھیں اور منہ حیرت کی زیادتی اور بے یقینی کے زیر اثر کھلتے چلے گئے۔

تحریر کا یہ منفرد اور خوب صورت انداز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی مگر یہ، یہ ادھورا مسودہ اور وہ بھی شاہ میر ابراہیم کے کمرے میں؟ اگلے ہی پل ہاتھ میں پکڑے پیپرز سرعت سے نیچے رکھتے ہوئے اس نے قریب پڑی فائل کھولی تھی اور لمحوں میں جیسے اس کی بے یقینی نے یقین تک کا سفر طے کر لیا تھا۔ کتنی ہی دیر دونوں ہاتھوں پہ سر گرائے وہ شل اعصاب اور ماؤف دماغ کے ساتھ سامنے پڑے ماہنامہ فلک کے ایڈیٹر کے خط کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی جو شاہ میر عارض کے نام لکھا گیا تھا اور جس پہ عمار ظفر کے آفس کا پتا درج تھا۔

اس حقیقت نے کہ اس کے بچپن کا دوست اور لڑکپن سے لے کر اب تک کا شوخ و شنگ، ہمہ وقت قہقہے بکھیرنے والا شاہ میر ابراہیم، انتہائی گہری اور مثبت طرز فکر رکھنے والا، سلجھی ہوئی اور متوازن شخصیت کا مالک، عارض ہو گا، کچھ اس طرح سے اس کے حواس سلب کیے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

کتنا زعم تھا اسے خود پر اور کتنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے اس نے ماہم ابراہیم کے سامنے اپنی حقیقت پسندی اور انسانی پرکھ کے مگر افسوس کہ اس کا کیا ہر دعوا جھوٹا پڑ گیا۔ ساری فہم و فراست اور عقل مندی دھری کی دھری رہ گئی اور آخر میں سب کے سامنے اس کی شخصیت کا جو تاثر ابھر کر آیا وہ محض ایک ایچور اور سطحی، آئیڈیلزم کی ماری لڑکی کا تھا۔ جو خود کو اپنے تئیں بڑی پریکٹیکل اور پختہ سوچ رکھنے والی سمجھے ہوئے تھی۔ مگر درحقیقت اتنی بھی عقل نہ رکھتی تھی کہ صحیح اور غلط کا اندازہ کر سکتی۔

کتنا درست کہا تھا ماہم نے کہ "ہر شخص کو ایک علیحدہ فرد کے طور پر پرکھنا سیکھو اور اس پرکھ میں ظاہری شخصیت اور اطوار کو اتنی اہمیت نہ دو کیونکہ آنکھوں کا دیکھا اور کانوں کا سنا ہمیشہ سچ نہیں ہوا کرتا۔"

اور یہی کمزوری اس کی ذات کا المیہ تھی، اس نے رضا احسان کو جاننے اور اچھا انسان کا ٹائٹل دینے کا دعوا کیا تھا محض اس کی مضبوط ظاہری شخصیت، دلنشین انداز و اطوار اور گہری گفتگو کی بنا پر مگر نتیجہ کیا رہا صفر! کیونکہ رضا احسان کی اس شخصی پرکھ میں مہر رحمٰن نے صرف اس کے خوشنما ظاہر کو اہمیت دی تھی۔ جس میں وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس طرح سے الجھتی چلی گئی کہ اس کے باطن کو کھوجنے کا خیال ہی نہ رہا۔ اور جب رضا کی ذات کا یہ اہم ترین پہلو از خود اچانک ابھر کر سامنے چلا آیا تو اس نے جانا کہ اس سے کتنی فاش غلطی سرزد ہو چکی تھی۔

اپنی اس غلطی کو زندگی کی پہلی اور آخری غلطی بنانا چاہا تھا اس نے، مگر اس کوشش کا نتیجہ بھی کیا رہا، صفر! لیکن اس صفر نے اس کی پوری ہستی کو صفر بنا ڈالا تھا کیونکہ اس بار جس شخصیت کو پرکھنے میں اس سے غلطی ہوئی تھی وہ کوئی اور نہیں اس کے بچپن کا دوست اور دم ساز تھا اور وہ کتنی نادان اور کم عقل تھی کہ ساری زندگی اپنی آنکھوں کے سامنے رہنے والے انسان کو نہ جان سکی۔ ہر لمحہ اسے اور اس کی پرخلوص محبت کو انڈر اسٹیمیٹ کرتی رہی اور وہ باظرف انسان بنا کچھ جتائے ہمیشہ ہنس کر اس کی بے رخی اور طنز کو برداشت کرتا رہا اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ مہر رحمٰن خود کتنے پانی میں ہے۔

اور آج جب قدرت نے اسے آئینہ دکھایا تھا تو اس کی اپنی ذات سے متعلق ہر خوش فہمی پانی کے بلبلے کی طرح لمحوں میں فنا ہو چلی تھی اور وہ ارد گرد سے غافل بس ایک ٹک سامنے پھیلی سچائی کو تکے جا رہی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ اسے شرمندگی اور ندامت کے گہرے سمندر میں غرق کرتی چلی جا رہی تھی۔

اپنے آپ سے بھی بے گانہ وہ مزید نجانے کتنی دیر اسی حالت میں بیٹھی رہتی جب اچانک دروازہ کھول کر شاہ میر نے اپنے دھیان میں کمرے میں قدم رکھا تھا۔ مگر اگلے ہی پل، رائٹنگ ٹیبل کے پاس زمین پہ سر پکڑے بیٹھی مہر اور اس کے سامنے بکھرے، صفحات،

نے ساری صورتحال اس پر عیاں کرتے ہوئے اسے ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کردیا۔

کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کیے بنا وہ نہایت خاموشی سے آگے بڑھا تھا اور مہر سے کچھ فاصلے پر زمین پر دو زانو جھکتے ہوئے اردگرد بکھرے پیپرز فائل میں ترتیب سے لگاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ہاتھ میں پکڑی فائل جگہ پہ رکھتے ہوئے وہ جوں ہی پلٹا نظر بے اختیار سامنے کھڑی ' خاموشی سے آنسو بہاتی ' مہر کی نظروں سے جا ٹکرائی۔ اگلے ہی پل ' شرمندگی سے برستی ان نادم آنکھوں کی ہر التجا نظرانداز کرتے ہوئے شاہ میر مقابل کھڑی ہستی کے پہلو سے نکلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا' مگر اس سے پہلے کہ اس کے قدم کمرے کی دہلیز کو پار کرتے' زاروقطار روتی مہر اسے بے اختیار پکار بیٹھی۔

"شا' شاہ میر! پلیز' پلیز مجھے م معاف کردو!" اس کے رک کر پلٹنے پہ مہر نے جھکے سر کے ساتھ کپکپاتے لہجے میں بمشکل اپنی بات مکمل کی۔

"معاف کردوں؟ مگر کس بات کے لیے؟" دونوں بازو سینے پہ لپیٹے وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ انتہائی سرد اور انجان لہجے میں گویا ہوا تو اس کے اس اجنبی انداز پر مہر نے بے اختیار جھکا سر اٹھا کر گہرے دکھ اور ملال سے اپنے اس مہربان دوست کو دیکھا تھا جسے وہ آج اپنی حماقتوں کے باعث پرایا کرچکی تھی۔

"م' م میں نے تمہارا جو دل دکھایا ہے۔ اس کے لیے پلیز مجھ مجھے معاف کردو۔" بات مکمل کرتے ہی وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو اتنے عرصے سے وہ جو خود پر صبر اور خاموشی کا بند باندھے ہوئے تھا بے اختیار پھٹ پڑا۔

"معاف کردوں اور وہ بھی تمہیں مہر رحمٰن؟ تمہیں؟ جسے آج جب قدرت نے خواہشات کی اندھی تقلید کی سزا دی تو اسے یاد آیا کہ اس نے کسی شاہ میر نامی بندے کا دل دکھایا تھا اور اگر جو آج تم محبتوں کے عذاب نہ جھیلتیں تو تمہیں تو کبھی اپنی — بے حس' سنگدل اور خودغرض فطرت کے ہاتھوں میرا خیال تک نہ آتا۔ اس انسان کا خیال جو تمہاری گزری زندگی کے ہر پل میں موجود تھا۔ جس نے گزرے دو سالوں کے ہر ایک لمحے میں تمہاری بے رخی — بے اعتنائی اور نفرت کے باوجود تمہیں خود سے بڑھ کر اس طرح چاہا کہ اس کی اپنی ذات ہی کھو کر رہ گئی۔

جس نے اپنی زندگی کی اتنی بڑی کامیابی اور خوشی اپنے پیاروں سے محض اس لیے چھپالی کہ وہ عارض کے لیے تمہاری دیوانگی ' تمہاری محبت اور تمہاری عقیدت دیکھ کر حیرت سے گنگ ہوگیا تھا۔ ہر اس بات ' ہر اس جذبے کو جو وہ اپنے لیے تمہارے لبوں اور تمہاری نگاہوں سے چھلکتا ہوا دیکھنے کا خواہش مند تھا' جب انجانے میں تم عارض سے منسوب کرنے لگیں تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

تمہارا کہا ہر ستائشی لفظ اس کے لیے آب حیات سے کم نہ تھا۔ شاہ میر ابراہیم نے صرف اور صرف — مہر رحمٰن کی خاطر' شاہ میر عارض کو سب سے چھپالیا۔ مگر دیکھو تو اتنا کچھ کرنے کے بعد آج بھی وہ نادان تنہا خالی ہاتھ وہیں کھڑا ہے جہاں سے کبھی چلا تھا اور اب تم چاہتی ہو کہ اپنی یہ تنہائی' یہ بے بسی' یہ تہی دامنی بھلا کر وہ تمہیں معاف کردے۔ نہیں مہر صاحبہ نہیں۔ وہ آپ کو اپنے دل' اپنی بے لوث محبت اور اپنے خوابوں اور ارمانوں کا خون اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے معاف نہیں کرسکتا۔"

وہ جواب تک خاموشیوں کے قفل لبوں پر لگائے بیٹھا تھا' مہر کی خواہش پر' جب بولنے پر آیا' اتنا بولا کہ مزید کچھ سننے کی حسرت نہ رہی۔ لیکن اس کے آخری جملے پہ اب تک پتھر کے بت کی طرح جامد کھڑی مہر بے اختیار تڑپ اٹھی۔

"پلیز شاہ میر! مجھے معاف نہ کرکے میری غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا کو اتنا طویل نہ کرو کہ میں سہہ نہ پاؤں۔ میں پہلے ہی بہت تکلیف میں ہوں شاہی میری التجا کو یوں رد کرکے خدارا میری اذیتوں میں مزید اضافہ نہ کرو۔" — آنسوؤں کے درمیان وہ کرب سے بولی تو شاہ میر کے لبوں پر بے اختیار ایک طنزیہ مسکراہٹ آن ٹھہری

"میں کیا اور میری ہستی کیا مہر صاحبہ! آپ کیوں مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔ آپ نے کوئی جرم تو کیا نہیں محض اپنی پسند اپنے آئیڈیل کو پانے کی ایک کوشش ہی تو کی تھی۔ تو کیا ہوا جو نئے رشتے بنانے کی اس کوشش میں آپ نے اپنے پرانے رشتے' دوستی' مان حتی کہ کسی کی محبت تک داؤ پر لگادی۔ یقین کریں کہ ہمہ وقت تماشا لگانے والے اور بقول آپ کے بے حس' ڈھیٹ اور سطحی سوچ رکھنے والے شاہ میر ابراہیم کے نہ ہونے سے آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ سو آپ پلیز بے فکر ہوجائیں اور اپنی زندگی کو پہلے کی طرح انجوائے کریں۔"

"پلیز شاہی اپنی ذات کے لیے ایسے تلخ الفاظ مت استعمال کرو۔"

"اپنی ذات کے لیے یا عارض کے لیے ایسے تلخ الفاظ استعمال نہ کروں؟" ابرو اچکا کر طنزیہ لہجے میں گہری چوٹ کی گئی تو بے اختیار مہر نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹا۔

"آئی ایم ساری لیکن کیا کروں کہ بات تو بہرحال ایک ہی ہے۔ اور تمہارے لیے خاصی شاکنگ بھی۔ تمہارے آئیڈیل کا امیج جو چکنا چور ہوگیا اور ہوتا بھی کیوں نہ کہاں میں کہاں عارض۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے مس مہر کہ آپ نے میرے قریب رہتے ہوئے بھی کبھی مجھے سمجھا ہی نہیں۔ اپنی بیوہ ماں کی اداسیوں اور تکلیفوں کو' ان کی اور ہم سب کی زندگی میں در آنے والی محرومی اور اس محرومی سے جنم لینے والی — بے شمار تلخیوں کو' اپنے بھائی پہ کم عمری میں پڑنے والے ذمہ داریوں کے عذاب کو ختم کرنے کے لیے میں ہمہ وقت ہنستا اور کھلکھلاتا رہتا تھا۔ اپنے قہقہوں اور شرارتوں سے اپنے گھر کی بے رونقی اور اداسی دور کر کے اپنے پیاروں کے لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول سجانا چاہتا تھا اور میری یہی طرز فکر میرا جرم بن گئی۔ ورنہ اندر سے تو میں شاید وقت سے پہلے بڑا ہوگیا تھا اتنا بڑا کہ میری سوچ میں در آنے والی پختگی اور حساسیت نے مجھے بہت پہلے ہی یہ شعور عطا کردیا تھا کہ مجھے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات سے وابستہ ان لوگوں کے لیے جینی ہے جو میرے اپنے ہیں' جو میرا سب کچھ ہیں۔"

تلخی سے بات کرتے کرتے اس کا لہجہ آخر میں یاسیت کے رنگوں میں ڈھل کر دھیما ہوچلا تو ان نئے انکشافات پہ مہر رحمٰن کے دل نے بے اختیار زمین پھٹنے اور اس میں اپنی تمام بے حسی سمیت دفن ہوجانے کی تمنا کی۔ اس جیسی خودغرض لڑکی واقعی شاہ میر جیسے بے غرض انسان کی معافی کے قابل نہ تھی۔

سچی محبت کیا ہوتی ہے اور کیسے ہر رشتے کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بنا کسی غرض کسی صلے کی چاہ کے یہ اس نے آج اسی لمحے جانا تھا اور ساری حقیقت عیاں ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس جیسی خواہشات کی ماری لڑکی کو کوئی سزا تو ضرور ملنی چاہیے۔ ایک پل' محض ایک پل لگا تھا اور ضمیر کی عدالت نے اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو شاہ میر' مجھ جیسی سطحی لڑکی' تم سی عظیم سوچ رکھنے والے مخلص بندے کی معافی کے قابل ہرگز نہیں۔ اپنے گناہوں کی تلافی کے طور پر میں اس پل بخوشی خود کو یہ سزا دیتی ہوں کہ مجھے اپنی باقی ساری زندگی تمہاری دوستی' تمہارے خلوص اور سب سے بڑھ کر تمہاری محبت کے بغیر گزارنی ہوگی۔ تم اب اگر اپنی محبت کو بھلا بھی دو گے تو بھی تم سے کوئی گلہ نہیں' لیکن ایک بات طے ہے کہ مہر رحمٰن اب آنے والے ہر لمحے' ہر پل میں تمہیں چاہے گی' اتنا چاہے گی کہ اس کی اپنی ذات شاہ میر ابراہیم کی ذات میں کہیں کھو کر رہ جائے گی۔"

مضبوط لہجے میں بیک وقت اپنا فیصلہ اور اعتراف محبت بغیر کسی جھجک کے سامنے کھڑے شاہ میر کو سناتے ہوئے اس نے تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھنا چاہا تو یک لخت اس کا بازو مضبوط شکنجے کی گرفت میں آگیا۔ اگلے ہی لمحے' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایک بار پھر شاہ میر کے روبرو تھی۔ مگر اس بار دونوں کے درمیان محض چند فٹ کا فاصلہ تھا۔

"اگر یہ سب کچھ طے ہے مہر رحمٰن! تو پھر یہ بات بھی طے تھی اور رہے گی کہ چاہے حالات جیسے بھی رہے ہوں شاہ میر ابراہیم نے کبھی کسی بھی حال اور کسی بھی موسم میں اپنی محبت سے دستبردار ہونے کا نہ کبھی سوچا تھا اور نہ کبھی سوچے گا کیونکہ اس کی محبت اچھے برے حالات کی کبھی بھی محتاج نہیں رہی اور اتنے خوب صورت اور واشگاف اعتراف کے بعد تو اسے مر کر بھی یہ تصور قبول نہیں۔ ان الفاظ کے بدلے میں، میں تمہاری غلطی تو کیا اپنا خون بھی تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔" اس کے بازو کو تھامے وہ مہر کی نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوری سنجیدگی اور مضبوطی سے گویا ہوا تو کتنی ہی دیر حیرت اور بے یقینی کے جذبات کے زیرِ اثر وہ ایک ٹک اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھے چلی گئی۔

"کیوں یقین نہیں آرہا کیا؟" مہر کے گلابی متورم چہرے پر پھیلے بے یقینی کے رنگوں کو دلچسپی سے تکتے ہوئے بظاہر اس نے بے تاثر لہجے میں پوچھا تو وہ فقط ایک لفظ میں اپنی کیفیت بیان کر گئی۔

"نہیں!"

"ہوں... تو چلو پھر یہ سنو۔

یہ میرا سارا ہنر تیری خوشیوں سے وابستہ
میرے سارے لفظوں پر تیری حکمرانی ہے
کھیل جو بھی تھا جاناں! اب حساب کیا کرنا
جیت جس کسی کی ہو ہم نے ہار مانی ہے

کہو اب یقین آیا؟" نرم مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے اس کی جانب جھک کر شرارت سے ایک بار پھر استفسار کیا گیا تو بے اختیار وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے پھپک کر رو دی۔

"اوں ہوں اب اور نہیں جتنا کہنا سننا اور رونا تھا سب ہو چکا۔ اب مزید ایک آنسو بھی میں تمہاری آنکھوں میں نہیں دیکھنا چاہتا۔" کہتے ہوئے اس نے نرمی سے مہر کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے چاہے تو وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

"یار! اب کیوں اس بری طرح سے رو رہی ہو؟" اتنی یقین دہانی کے باوجود اس کے رونے میں کمی واقع نہ ہوئی تو وہ بے اختیار جھنجلا گیا۔

"م... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ہاتھوں کے پیچھے سے گھٹی گھٹی آواز میں وجہ بیان کی گئی تو وہ بے ساختہ اپنی حیرت کا اظہار کر بیٹھا۔

"ہیں؟ ڈر لگ رہا ہے؟ لیکن وہ کیوں بھئی؟"

"لوگوں کی باتوں اور گھر والوں کے ری ایکشن سے، سب کیا کہیں گے شاہی!" سابقہ انداز میں چھکوں چھکوں روتے ہوئے خدشات کا اظہار کیا گیا تو اب کے کھل کر ہنستے ہوئے اس نے مہر کے دونوں ہاتھ زبردستی چہرے سے ہٹاتے ہوئے اپنی گرفت میں لے لیے۔

"محترمہ، ہم سے محبت میں آج سے نہیں پچھلے دو سال سے کرتا چلا آرہا ہوں اور وہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر اور دیکھو آج تمہیں میں نے بالآخر اپنی ثابت قدمی سے جیت ہی لیا اور اب باقی سب کو بھی بہت جلد اپنے زورِ بازو پر راضی کر لوں گا۔ ویسے آپس کی بات ہے عمار کے بعد شاہ زر بھائی بھی اس راز میں شامل ہو چکے ہیں اور ان کا... ووٹ ہمارے حق میں ہے۔"

"کیا سچ؟"

"بالکل سچ۔ بس ذرا یہ شادی کے ہنگامے..."

"شادی کے ہنگامے اوہائی گاڈ! میں کب سے یہاں گھسی بیٹھی ہوں۔ باہر تو میری ڈھنڈیا مچ گئی ہوگی اور اگر کوئی اس دوران کمرے میں آجاتا تو" "تو کیا سوچتا؟" فق پڑتی رنگت کے ساتھ اس نے تیزی سے شاہ میر کی بات کاٹتے ہوئے اپنے ہاتھ چھڑانا چاہے۔

"کیا سوچتا یعنی کہتا کہ 'دو دل مل رہے ہیں مگر چپکے چپکے۔'" معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب جھکتے ہوئے وہ دھیمے سروں میں گنگنایا تو اگلے ہی پل گلابی چہرے اور جھکی پلکوں کے ساتھ مہر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑا کر سامنے کھڑے شاہ میر کو دھکا دے کر بھاگتی ہوئی دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ جب کہ اس کے پیچھے کمرے میں کھڑا شاہ میر اور کھڑکی سے جھانکتی سہانی شام دونوں ہی اس خوب صورت اور یادگار ملن پر کھل کر مسکرا دیے تھے۔

☼ ☼